Gohar e tehqeeq گوہر تحقیق
گورنمنٹ صادق کالج ویمن یونیورسٹی بہاول پور

Year 2025; Vol 04 (Issue 01)

P. 01-18 https://journals.gscwu.edu.pk/

ڈاکٹر کامران عباس کاظمی

انچارج شعبہ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

Dr. Kamran Abbas Kazmi

Incharge Urdu Department, International Islamic University, Islamabad

اکیسویں صدی میں اردو ناول: سماجی آگہی کا مطالعہ

Urdu Novel in the 21st Century: A Study of Social Awareness

Abstract:

In the early decades of the 21st century, the Urdu novel effectively highlighted the complex realities of Pakistani society. The scope for change within the society is progressively shrinking, resulting in a deep social conflict that is impacting the entire social system. The ruling classes are making concerted efforts to preserve this decaying system to safeguard their exploitative interests, viewing any new change as a threat to their political and economic gains. Against this backdrop, the Urdu novel has presented these grave issues with a sense of realism. In the 21st century, troubling changes have emerged within Pakistani society, notably the rise of consumerism, class disparities, and extremism. Urdu novelists have not only incorporated these issues into their narratives but have also analyzed them critically. Through various novels, the effects of social stratification, class differences, and the impact of democratic and military governments have been illuminated. Novelists like Hassan Manzar, Muhammad Asim Butt and Mirza Athar Baig have made global influences, terrorism, and social issues in Pakistan the central themes of their work, resulting in a significant transformation in the creative landscape of the Urdu novel. Although the search for new creative dimensions in this genre continues, the Urdu novel remains distinctive in its ability to present the complexities and internal contradictions of society in a profound manner.

Keywords: Novel and Pakistani Social Crisis, Contemporary Social Issues, Global Supremacy, Capitalist System and Consumerism, Identity Crisis, Globalization and its Effects, Racial and Linguistic Conflicts, Existential Anguish, Collapse of Human Values, Skepticism and Uncertainty

کوئی بھی سماجی نظام جب تاریخی اعتبار سے متروک ہو جاتا ہے یا نئی تاریخی و عصری صورتحال میں اس کی اہمیت و ضرورت ختم ہو جاتی ہے اور اس میں ارتقایا تبدیلی کی گنجائش ناپید ہو جاتی ہے تو اس کا بحران معاشرے کی رگوں اور شریانوں میں ایک شورش اور خلفشار پیدا کر دیتا ہے۔ ایسے معاشروں کی زندگی کا ہر پہلو، ہر شعبہ گلنے سڑنے لگتا ہے لیکن حکمران طبقات اس نظام کو مسلط رکھنے کے لیے ہر حربہ استعمال کرتے ہیں اکثر اوقات وہ کامیاب رہتے ہیں لیکن اس صورت میں کہ وہ دبائو پیدا کرنے والے عناصر کا محفوظ اخراج کر دیتے ہیں گویا کسی حد تک تبدیلی برداشت کر لی جاتی ہے لیکن مکمل تبدیلی پاکستان سے مماثل سماج میں قبول نہیں کی جاتی۔ دنیا بھر میں اکیسویں صدی کو تبدیلی، سائنسی انکشافات، بہتر انسانی مستقبل، جمہوریت اور انسانی آزادیوں کے تصور کے ساتھ خوش آمدید کہا گیا لیکن پاکستانی سماج ایک بار پھر فوجی استبداد کا نشانہ بن چکا تھا۔

تخلیقی فنکاروں کا سماجی شعور بالعموم اس امر سے آگاہ ہو چکا ہے کہ پاکستانی ریاستی اختیار و اقتدار میں جمہوری ادوار ہوں یا فوجی کوئی بڑی اور نمایاں تبدیلی پیدا نہیں ہوتی کیونکہ جمہوریت فوج کی اجازت کے ساتھ پائوں پسارتی ہے اور جب فوجی اقتدار ملک کے سیاہ سفید کا براہ راست مختار بن جاتا ہے تو سیاست دان اس بوسیدہ نظام کو کندھا دینے حاضر ہو جاتے ہیں۔ دوسری اہم بات پاکستانی تخلیق کاروں نے شدت سے محسوس کی ہے کہ حکومتی ایوانوں میں آمدورفت دنیا کی بڑی طاقت کی مرضی و منشا کے مطابق ہوتی ہے، عوام محض تماشائی ہیں اور تماشا بھی۔

اکیسویں صدی کے ناول کا ایک موضوع تو امریکی بالادستی اور اس کے سائے میں سرمایہ دارانہ نظام کا پھیلائو ہے۔ دوسرا اہم موضوع پاکستان جیسے ملکوں کو پیداواری ملک بننے سے روک کر یہاں صارفیت کے کلچر کا فروغ ہے تاکہ تیسری دنیا کے عوام مستقل سامراج کی منڈیاں بنی رہیں۔ تشدد، خوف اور بنیاد پرستی بھی پاکستانی سماج کا اہم مسئلہ ہے اور ان مسائل کی پیداوار دراصل اس سماجی و سیاسی شعور کی کمی ہے جو ہمارے نظام تعلیم کی پیداوار ہے۔ ملک کا نظام تعلیم آج بھی طبقات میں منقسم ہے اور آقا و غلام کی تفریق پر استوار ہے۔ عوام کے سماجی، تاریخی اور سیاسی شعور کو پختہ کرے، بندہ و آقا کی تمیز ختم کرے اور بچوں میں خود اعتمادی پیدا کرے، اگر ایسا نظام تعلیم مہیا کر لیا جاتا تو یقینا پاکستانی سماج اپنی منزل متعین کر لیتا اور آج سماج میں موجود شدید تقسیم جو بظاہر مذہبی نظر آتی ہے، سے چھٹکارا مل گیا ہوتا۔ ناول نگاروں نے اس پہلو کی سنگینی کا اندازہ کر لیا تھا۔

اشفاق رشید کے ناول "شدت" سے اقتباس دیکھئے:

> "اللہ کا فرمان ہے سب انسان برابر ہیں، محنت کشوں کی بستی میں تحریک کا جلسہ تھا۔ اس بستی کے ایک خستہ حال سرکاری سکول کے پاس سے گزرتے اندر سے بچوں کے رٹا لگانے کی

آوازیں آرہی تھیں کہ اس لمحے میرے ذہن میں شہر کے سکول گھوم گئے جہاں کے نصاب
میں انسان درجوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ یہاں بھی ہمارا نصاب ایک نہیں۔" (۱)

تعلیمی پالیسی کے نام پر عوام کو سہانے خواب دکھائے جاتے ہیں۔ محض فائلوں کا پیٹ بھرا جاتا ہے جبکہ سماجی ناہمواری کو جوں کا توں رکھا جاتا ہے۔ شاہد صدیقی نے تو تعلیمی نظام اور اس کی خامیوں کو باقاعدہ اپنے ناول ''آدھے ادھورے خواب'' کا موضوع بنایا ہے:

" ''سر! آپ نے ہماری نئی تعلیمی پالیسی کا ڈرافٹ دیکھا ہے؟''
میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
''سر! اس میں کہیں بھی سماجی ناہمواریوں کو کم کرنے کے لیے نہ کوئی ویژن ہے نہ ہی ایکشن پلان۔'' بینش بولی
''معاشرے کے طاقتور طبقے نہیں چاہتے کہ معاشی اور سماجی ناہمواریاں کم ہوں۔ ایسا ہونے سے ان کی اپنی پاور بیس خطرے میں پڑ جاتی ہے۔''
میں نے بات جاری رکھی۔
''تعلیمی ادارے معاشی اداروں اور سماجی فرق کو کم کرنے کے بجائے اور بڑھا رہے ہیں۔ آج سے تیس سال پہلے غریبوں کے بچے بھی اعلیٰ عہدوں پر پہنچ جاتے تھے۔ لیکن آنے والے دنوں میں شاید ایسا ممکن نہ ہو۔" (۲)

اس تعلیمی درجہ بندی نے سماج کو طبقاتی نظام میں عملاً تقسیم کر رکھا ہے، یہ نظام لوگوں میں سستی جذبائیت، خیالات میں سطحی پن پیدا کرنے اور سماجی و جمہوری شعور اور انسانی آزادی و بنیادی حقوق کے تصورات سے نابلد رکھنے میں بہت موثر ہے۔ سلمان صدیق اسی لیے اس ہجوم کو ''مرے ہوئے لوگ'' کہہ کر مخاطب کرتا ہے:

"حکومت چونکہ انگریزی غلاموں کی آتی اور جاتی ہے، اس لیے اپنی شناخت، تہذیب، کلچر یہ سب کچھ ادھورا پڑا ہے۔ بکھرا ہوا ہے۔ انگریزوں کی، قوم سے غداری کے صلہ میں بخشی ہوئی زمینوں پر مزارعوں اور کسانوں پر ظلم ہوتا ہے اور ان پر ان کے کمی ہونے کا لیبل چپکا رہتا ہے اور ایوان اقتدار میں وہی لوگ عوام کو بے وقوف انہیں اپنے مزارعوں کی طرح ہانکتے ہیں۔ اور چونکہ یہ سب لوگ جو عوام ہیں۔ مردہ ہیں۔ مرے ہوئے ہیں۔ اس لیے ان کے ہاتھ گریبانوں تک حرکت کرنے سے قاصر ہیں۔ جمہوریت کے نام پر مچی لوٹ میں یہ

لٹتے ہیں اور مر جاتے ہیں، یہ صرف دیکھنے میں زندہ ہیں ورنہ مرے ہوئے لوگ ہیں یہ۔ ہاں
جاگتے ہیں جب کوئی مذہب کا نام لیتا ہے لیکن ان کی یہ بیداری جہالت کی آخری سطح کی غمازی
کرتی ہے۔" (۳)

مذہبی جذبات بھڑکا کر فسادات کرانے کے مناظر اب ہماری زندگیوں کے روزمرہ کا حصہ بن چکے ہیں۔ کہنے کو پاکستانی سماج اکیسویں صدی میں داخل ہو چکا ہے لیکن لوگوں کے رویے اور ان کی ذہنی صلاحیت اب بھی ناپختہ ہیں۔ اس کا دوش تعلیمی نظام کے علاوہ ریاست کے دیگر اداروں کا بھی ہے۔ ریاستی پالیساں بنانے والے بھی انتہائی سطحی سوچنے اور فکر کرنے کی صلاحیت کے حامل ہیں کیونکہ ان کا بنیادی مقصد اپنے وسائل میں اضافہ کرنا ہے۔ ریاست کے ساتھ ان کی وفاداری استوار ہی نہیں ہو سکی۔ ''زمین کا دکھ'' میں محمد سعید شیخ نے ایسے ہی عوامل کو موضوع بنایا ہے کہ عوام کی ذہنی سطح بلند کیے بغیر تبدیلی کے محرکات بھی جنم نہیں لے سکتے۔ مثلاً گڈ گورنینس کے لیے سفارشات تو مرتب کی جاتی ہیں لیکن ان کا سماج کی عملی حالت سے کتنا تعلق ہے اس سوال کا جواب تلاش نہیں کیا جاتا:

چیئرمین نے میٹنگ کا آغاز کیا۔ شرکاء کو خوش آمدید کہا۔ ان شرکاء میں سرکاری محکموں کے افسران کے علاوہ کچھ ایکسپرٹس بھی بلائے گئے تھے۔

"اکیسویں صدی میں داخل ہونے کے لیے، ہمیں اس بوسیدہ نظام کو بدلنا ہوگا۔ اداروں کو فعال بنانا ہوگا۔ احتساب کے عمل کو شفاف اور مستقل بنیادوں پر قائم کرنا ہوگا۔ کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور ای میل اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کی مدد سے، اس ملک کے اداروں کی ماڈرن طریقہ سے ریسٹرکیچرنگ کرنا ہوگی۔ ہمارے پاس ترقی یافتہ ملکوں کے علاوہ، ملائیشیا، کوریا، تائیوان کی مثالیں موجود ہیں۔۔۔ ہم اس موضوع پر ایک سیمینار منعقد کر رہے ہیں جس کی سفارشات اس ٹاسک فورس کی منظوری کے بعد گورنمنٹ کو بھیج دی جائیں گی۔" (۴)

یہی وہ دکھاوے کے اقدامات ہیں جو حکومتیں کرتی رہتی ہیں اور ہر حکومت ہر مسئلے پر ایک نئی ٹاسک فورس بٹھا کر از سر نو سارے عمل کو انجام دینے لگتی ہے جبکہ اداروں میں اصلاح کا کام آغاز نہیں ہو پاتا۔ دراصل یہ مفاد یافتہ طبقہ چاہتا بھی نہیں کہ نظام میں کوئی تبدیلی پیدا کی جائے کیونکہ ایسا کرنے سے تبدیلی کو راستہ مل جائے گا سو عوامی حق میں آنے والی تبدیلیوں کے راستے پاکستانی سماج کے اشرافیہ طبقات باہم مل کر مسدود رکھتے ہیں۔ ترقی کے جو پیمانے وضع کر لیے گئے ہیں یہ حقیقی پیمانے نہیں

ہیں کیونکہ جب تک لوگوں کے مزاج اور ذہنوں میں وسعت نہیں آئے گی ملک میں موبائل فون کی تعداد بڑھنے سے تبدیلی نہیں آئے گی۔ تبدیلی کے اس سماجی شعور کا اظہار شاہد صدیقی نے یوں کیا ہے:

"میں چائے کی ہمراہی میں امرتیا سین(Amertyasen) کی کتاب ڈیویلپمنٹ ایز فریڈم (Development as freedom)پڑھ رہا تھا۔ جس میں ڈیویلپمنٹ ناپنے کے روایتی پیمانے کو چیلنج کیا گیا تھا۔ اور اس کا براہ راست تعلق لوگوں کی آزادی اظہار اور مختلف طرح کے Freedoms سے جوڑا گیا تھا۔ دوسرے الفاظ میں برے بڑے ڈیم، کشادہ سڑکوں کا جال، بلند و بالا عمارتیں ڈیویلپمنٹ کے لیے کافی نہیں جب تک لوگوں کو صحت، تعلیم، آزادی افکار اور آزادی کار میسر نہ ہو۔" (۵)

تبدیلی اور ترقی کے اسی عمل کو سعید شیخ نے انسانی عنصر کے لازمے کے ساتھ دیکھا ہے:

"میری آبزرویشن تو یہ ہے سر کہ جب ہم اداروں اور نظام کی تبدیلی اور اس کی ریسٹرکچرنگ کی بات کرتے ہیں تو ہم ایک بہت بڑے فیکٹر کو نظر انداز کر جاتے ہیں اور وہ انسانی عنصر۔ انسان کا معیار بدلے بغیر ہم اپنا کوئی بھی ہدف پورا نہیں کر سکیں گے۔" (۶)

اکیسویں صدی کا آغاز دراصل ادب، ثقافت یا فنون لطیفہ سے سرد مہری کے رویے سے ہوا ہے۔ لوگ اقتصادی زبوں حالی کا شکار ہیں اور صارفیت کے اس کلچر میں اشیا ان کی قوت خرید سے نکلتی جا رہی ہیں۔ اس کے باوجود غنیمت ہے کہ کچھ بہتر ناول اردو میں شائع ہوئے ہیں۔ اکیسویں صدی میں دو متوازی نسلیں موجود ہیں جو تخلیقی محاذ پر سرگرم ہیں۔ ان میں کچھ ایسے ہیں جو بطور ناول نگار اپنی پہچان گذشتہ صدی میں بنا چکے تھے اور کچھ ایسے ہیں جن کے تخلیقی سفر کا آغاز تو گذشتہ صدی کے آخری دو عشروں میں ہو گیا تھا لیکن ناول نگاری کی طرف وہ اکیسویں صدی میں مائل ہوئے۔ اول الذکر کا نمائندہ مستنصر حسین تارڑ ہے۔ ''قلعہ جنگی''، ''ڈاکیا اور جولاہا''، ''خس و خاشاک زمانے'' اور ''اے غزال شب'' اکیسویں صدی میں شائع ہونے والے ناول ہیں۔ جبکہ مؤخر الذکر میں مرزا اطہر بیگ کا نام اہم ہے۔ ان کے دو ناول ''غلام باغ'' اور ''صفر سے ایک تک'' شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ محمد حمید شاہد کا ناول ''مٹی آدم کھاتی ہے'' بھی اکیسویں صدی کا قابل ذکر ناول ہے۔ اکیسویں صدی میں جن نئے لکھنے والوں نے ناول لکھ کر اپنی شناخت بطور ناول نگار کرائی ان میں سے چند کا ذکر تو ہو چکا ہے چند دیگر ناموں میں حسن منظر، محمد عاصم بٹ، زاہد حسن، وحید احمد، فرانسیسی نژاد ژولیاں قابل ذکر ہیں۔ کیسویں صدی کے ایک دہائی کے زائد عرصہ میں بہت کم ناول سامنے

آئے اور ان میں اچھے ناول مزید کم ہیں۔ البتہ نئے لکھنے والوں کے پاس وہ فکری توانائی موجود ہے کہ وہ نئے موضوعات کو ناول کا حصہ بنا سکیں۔

بقول امجد طفیل:

"اگرچہ باعتبار کمیت یہ دہائی کوئی اتنی بار آور نہیں ہوئی کہ دس گیارہ برسوں میں تیس چالیس ناول کی اشاعت تو کچھ ایسی خوش کن بات نہیں ہے مگر اگر معیار پر نگاہ ڈالی جائے تو اس دہائی میں چند ایسے ناول ضرور سامنے آئے ہیں جنہیں ہم اردو ناول کی روایت میں بھرپور اور جان دار اضافہ قرار دے سکتے ہیں۔" (۷)

حسن منظر کا تعلق افسانہ نگاروں کے اس گروہ سے ہے جنھوں نے بیسویں صدی میں اپنی شناخت بنائی۔ البتہ بطور ناول نگار ان کی شناخت اکیسویں صدی میں ہوئی۔ ان کا پہلا ناول "دھنی بخش کے بیٹے" سندھ کے دیہاتوں کی زندگی اور طبقاتی نظام کا بیانیہ ہے۔ ماجرا کمزور ہے اور نظریاتی مباحث کے ذریعے مصنف اپنے عصر کے حالات واضح کرنا چاہتا ہے۔ البتہ جہاں جہاں کرداروں کے ذریعے کہانیت کو فروغ یا ارتقا ملا ہے وہ حصے زیادہ دلچسپ ہو گئے ہیں گائوں کے جاگیر دار اور عام افراد کی زندگیوں کے مابین جو سماجی فاصلے اور معاشی تفاوت ہے وہ اس ناول کا موضوع ہے۔ طبقاتی نظام اس حد تک سماج کی رگوں میں سرایت کر چکا ہے کہ ذرا شعور سنبھالنے پر لوگ خود بہ خود اسے اپنا لیتے ہیں:

"مشکل یہ ہے کہ یہاں کے لوگ بڑے ہونے پر خود اپنی شناخت بدل دیتے ہیں۔ بڑی آسانی سے حاکم اور محکوم بن جاتے ہیں۔ ساتھی نہیں رہتے۔ خواہ اس کی توقع ان سے کی جائے یا نہیں، کم حیثیت پرانے دوست جب ملتے ہیں ایسے ملتے ہیں جیسے غلام ہوں اور باحیثیت پرانے ساتھی خود اسے اپنا بیاج سمجھنے لگتے ہیں جسے ادا کرنا ان کے نزدیک کم حیثیتوں پر فرض ہوتا ہے۔" (۸)

المیہ یہ ہے کہ جبر کا یہ نظام اکیسویں صدی میں بھی قائم ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ اقتدار پر براجمان طبقات سماج کی صورتحال کو بدلنا بھی نہیں چاہتے۔ مثلاً مذکورہ ناول میں جدید زندگی کی تمام آسائشیں گھر میں موجود ہیں لیکن گھر کی خواتین بھی ویسی ہی گنوار ہیں جیسی دیہات کے ہاریوں کی خواتین جاہل ہیں۔ ناول قدیم اور جدید زندگی کے تصادم سے آگے بڑھتا ہے:

"اس (ناول) کی آئیڈیالوجی دو تہذیبوں کا تصادم ہے جس کو حسن منظر نے ناول میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔۔۔ اور اس میں پائی جانے والی برائیوں اور کمزوریوں کو منظر عام پر

لانے کی کوشش کی گئی ہے۔۔۔ تہذیبوں کے درمیان تصادم کو کچھ ایسے عمل کے ذریعے سماج کے سامنے رائج کیا کہ لوگ اسے فطری سمجھتے ہیں اور جو کچھ بتانے کی کوشش کی ہے اس پر کسی حد تک قاری متفق بھی ہو جاتا ہے۔" (۹)

اکیسویں صدی میں بھی قائم جاگیر دارانہ سماج ناول کا موضوع ہے۔ گو کہ یہ طبقاتی سماج ایک مسلسل تاریخی عمل کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے لیکن جدید تصورات، جمہوریت، انسانی آزادی وغیرہ نے استحصال کی بنیاد پر قائم اس نظام کو بدلنے کی کوئی عملی کوشش نہیں کی۔ احمد بخش ایک ایسا کردار ہے جو اپنے گائوں کی حد تک سماجی تبدیلی لانا چاہتا ہے لیکن وہ اس عملی قوت سے محروم ہے جو استحصال پر قائم نظام اور لوگوں کے رویے بدلنے کے لیے درکار ہوتی ہے:

"احمد بخش نے کئی بار اپنے ملنے والوں کو کرید کر دیکھا کہ ان میں بہ ظاہر آتش فشانی چٹانوں کے پتھروں جیسے سروں میں کسی بہتر زندگی کی خواہش ہے بھی یا نہیں، وہ سوچتا تھا اگر دو چار ایسے آدمی مل جائیں جو لوگوں کے لیے بہتر زندگی پیدا کرنے کی خواہش رکھتے ہوں تو وہ اولا کو فون پر بتائے گا کہ ہمیں اپنے پروگرام کے لیے چند ساتھی مل گئے ہیں۔ لیکن معاملہ یوں تھا کہ ان لوگوں کو بے چارگی اور بیماریوں کے مسئلے میں دلچسپی نہیں تھی۔ یہ کام خدا کے کرنے کا تھا کیوں کہ اس نے زیادہ تر کو غریب اور محتاج بنایا تھا اور کچھ کو معقول اور صحت مند۔" (۱۰)

تقدیر پرستی دراصل سرمایہ دارانہ سماج کا خاص ہتھیار ہے۔ اس نظام اور اس کی مکاریوں کو نوآبادیاتی سامراج نے مزید مستحکم کیا تھا اور ان کے چلے جانے کے بعد ان کے ہمدرد اور خیر خواہ اسے برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ نئے صنعتی تمدن نے شہری سماج میں بالخصوص معاشرت، اجنبیت، احساس تنہائی، عدمیت، لغویت جیسے ابعاد کو جنم دیا ہے۔ انسان مرکز مہابیانیے ختم ہو گئے ہیں درحقیقت انسان کی مرکزیت کی جگہ اشیاء کی مرکزیت نے لے لی ہے۔ اس سے ایک نئی صورتحال نے جنم لیا ہے۔ جہاں فرد کا سماج سے رابطہ منقطع ہو رہا ہے اور سماجی شکست وریخت کا عمل مزید گہرا ہو گیا ہے۔ محمد عاصم بٹ کا ناول شہری زندگی اور فرد کی اکائیت پر مشتمل ماجرا ہے جہاں فرد نے اپنی شناخت گم کر دی ہے کیونکہ وہ اب کائنات کا مرکزہ رہا ہی نہیں۔ عاصم بٹ کے افسانوں اور ناول ''دائرہ'' کا موضوع بھی زندگی کے بے معنویت، لغویت اور بے کیفی ہے جو جدید انسان کا المیہ بن چکی ہے۔ عاصم بٹ کے ناول ''دائرہ'' میں خلا ہے بھی اور نہیں بھی۔ انسان جنم لیتا ہے اپنا کردار نبھاتا ہے اور مر جاتا ہے اور اس کی جگہ دوسرے انسان لے لیتے ہیں گویا زندگی ایک دائرہ ہے۔ یوں بھی ممکن ہے کہ انسان کی تقدیر دائروی ہے۔ جو المیہ یا دکھ وہ

نسلوں سے سہتا آرہا ہے وہ آج بھی سہتا ہے۔ عاصم بٹ کے کردار زندگی کی ظاہری چکاچوند سے اکتائے ہوئے کردار ہیں اور فی زمانہ صارفیت کے کلچر نے سیاسی و سماجی منظر نامے کو تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ انسان اپنی شناخت بطور انسان کھو چکا ہے۔ اس کا تعارف اشیا بن گئی ہیں اور وہ ''اشتہار آدمی'' بن گیا ہے:

"اس دور میں زندگی اس قدر الجھ گئی ہے کہ انسان اپنی پہچان بھول کر اس مصنوعی دنیا میں کھو گیا ہے۔ اس کے پاس اتنا وقت ہی نہیں کہ وہ اپنے باطن میں جھانک سکے۔ لیکن محمد عاصم بٹ کے ناول ''دائرہ'' کے کردار راشد کا یہ مسئلہ ہے کہ وہ اپنی پہچان چاہتا ہے۔ وہ اپنے اندر خود کو تلاش کرتا ہوا نظر آتا ہے اور اس طرح پوری کہانی دائرے میں گردش کرتی رہتی ہے۔" (۱۱)

راشد ایسا کردار ہے جو شناخت کے بحران کا شکار ہے اور جب فرد سماج میں کوئی شناخت ہی نہ رکھتا ہو تو زندگی اس کے لیے بے معنویت، معاشرت اجنبیت کا مجموعہ بن جاتی ہے۔ دراصل یہ ایک کردار نہیں بلکہ یہ سماج کا نمائندہ کردار ہے گویا مابعد جدید صورتحال میں فرد فرد سے کٹ چکا ہے اور اپنی مرکزی حیثیت سے دستبردار ہو چکا ہے لیکن وہ افراد جو سوچتے ہیں اور سماج میں انسان کو مرکز سمجھتے ہیں ان کے لیے زندگی اور سماج اجنبی ہو چکے ہیں سو وہ عدم شناخت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ''دائرہ'' میں یہ کیفیت کرداروں کے ساتھ آغاز سے ہی موجود ہے۔ مثلاً راشد کردار جو مختلف کرداروں کے بہروپ بھرتا ہے بالآخر اپنی اصل شناخت کھو بیٹھتا ہے اور اپنی منکوحہ کو بھی پہچاننے سے انکار کر دیتا ہے:

"میں اب مزید یہاں نہیں رک سکتا۔۔۔ میں معافی چاہتا ہوں میری وجہ سے آپ کو ذہنی کوفت ہوئی۔ آپ نے کھانا کھلایا بہت اچھا پکا ہوا تھا۔ بہت شکریہ۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو آپ کی مدد کرتا راشد صاحب کو تلاش کرنے میں مجھے افسوس ہے کہ آپ کو یہ جان کر دکھ ہوگا کہ جسے آپ اپنا خاوند سمجھ رہی تھیں وہ اصل میں کوئی اور ہے مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔" (۱۲)

مابعد جدید تصورات نے معنی کی تہہ داری کے جنم میں دراصل انسان کی تہہ در تہہ ذات کے المیے کو بھی جنم دیا ہے۔ اور یہ المیہ عدم شناخت یا انسان کی حتمی شناخت کا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید ناول ''دائرہ'' کو پر اسرار ناول قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آصف مراد اور راشد ہی نہیں اس معاشرے کے ہر فرد نے ایک چہرے پر دوسرا چہرہ لگا رکھا ہے۔ سب اس دنیا کی فلم کے اداکار ہیں اپنی زندگی کے ڈرامے کا سکرپٹ بھی ہر شخص نے خود لکھا ہے۔" (۱۳)

عاصم بٹ کے کرداروں کا تعلق شہر کے جدید تمدن سے ہے اور جو اشتہاری کمپنیوں سے متاثر ہوتے ہیں اور اشیا کے ہجوم میں کھو کر رہ جاتے ہیں یہ تمام کردار عام اور مروج اخلاقی اقدار سے محروم ہیں۔ دراصل تیزی سے بدلتی زندگی کا ساتھ دینے میں یہ کہیں پیچھے رہ گئے ہیں اس لیے اب زندگی سے گریز کا رویہ اپنائے ہوئے ہیں۔ یہی اکیسویں صدی کے انسان کا المیہ ہے کہ اسے زندگی مجہول نظر آتی ہے۔ مقصدیت سے تہی اور بے سمت زندگی ان کرداروں میں سماج کے اندر اور سماج کے ساتھ معاشرت اور اجنبیت کا احساس گہرا کر دیتی ہے۔ حتیٰ کہ ملک میں ایک اور فوجی استبداد کا عہد آغاز ہوتا ہے لیکن لوگ اسی خول میں دبکے بیٹھے ہیں۔ ان کی لاتعلقی مزید بڑھتی جاتی ہے:

"مارشل لا ایک عرصے سے کسی بھیانک خواب کی طرح ملک پر مسلط تھا۔ گو جب ایسا ہوا تو بہت پہلے سے اس سے متعلق مختلف حلقوں میں پیش گوئیاں کی جارہی تھیں۔ لیکن لوگ ایسی آنا فاناً ہونے والی تبدیلیوں کے عادی ہو گئے تھے ایک صبح اخبارات میں شائع ہونے والی اس خبر سے کہ اسمبلیوں کو منسوخ کر کے فوج نے ملکی انتظام کو سنبھال لیا ہے، عوامی سطح پر بظاہر کوئی ہلچل پیدا نہ ہوئی۔ جیسا کہ کچھ پہلے تھا، الٹا سیدھا، بے ڈھنگا، وہ سب کچھ ویسے کا ویسا ہی رہا۔۔۔لوگ باگ بے فکر تھے۔" (۱۴)

لاتعلقی، اجنبیت اور معاشرت سے عدم دلچسپی وغیرہ اس خاص عہد جسے مابعد جدید کہا جارہا ہے، کی دین ہے اس کا اظہار دیگر ناول نگاروں کے ہاں بھی ہوا ہے۔ محمد حمید شاہد کا شمار معتبر اردو افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ قبل ان کا اردو ناول ''مٹی آدم کھاتی ہے'' منظر عام پر آیا۔ امجد طفیل اس ناول کے ماجرے کی تہہ داری کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ناول میں بیانیہ ایک سے زیادہ سطحوں پر جاری ہے۔ راوی در راوی کی تکنیک نے ''مٹی آدم کھاتی ہے'' میں معنوی تہ داری پیدا کی ہے۔ اپنے، اپنوں کی موت کا سبب بنتے ہیں۔ رشتے ٹوٹتے ہیں اور ناتے جڑتے ہیں۔ مگر زندگی بس ایک نشیب میں لڑھکتی جارہی ہے۔ یہ ناول اس اعتبار سے بھی منفرد ہے کہ اس میں ناول نگار نے المیہ مشرقی پاکستان کو ہماری تہذیبی زندگی کے دائرے میں رکھ کر دیکھنے کی کوشش کی ہے۔" (۱۵)

سانحہ مشرقی پاکستان اس ناول کا موضوع ضرور بنتا ہے لیکن جس تہذیبی زندگی کی طرف امجد طفیل نے اشارہ کیا ہے وہ واضح اظہار نہیں کرتی۔ ویسے بھی مابعد جدید فکریات میں سے ابہام اس ناول کی خصوصیت ہے۔ بہت سے سوال اور منظر ناول نگار ان کہے چھوڑ جاتا ہے۔ ناول نگار کے سماجی شعور میں یہ امر راسخ ہو چکا ہے کہ عوام ہمیشہ بے خبر رہتے ہیں گویا سماج کے عام افراد

حقائق سے آشنا نہیں ہوتے لیکن وہ ایک سرگرمی نہایت تندہی سے سرانجام دے رہے ہوتے ہیں یہی کافکائی اثرات ہیں جو عاصم بٹ کے ناول میں بھی نظر آتے ہیں۔ مثلاً ذیل کے اقتباس میں التباس حقیقت کی مثال دیکھئے:

> "اب تک کی فوجی زندگی میں یہی دیکھا گیا تھا کہ افسروں اور جوانوں کی چھاتیاں کسی بھی ان جانی مہم پر نکلنے سے پہلے کچھ ولولوں سے بھر جایا کرتی تھیں اور اس کا سبب شاید اس کے سوا کچھ اور نہیں تھا کہ ہمارے محسوسات کو کمال نفاست اور چالاکی سے مرتب کیا جاتا کہ ہم اسے ہی سب سے ارفع انسانی قدر سمجھنے لگتے تھے۔ ایک ایسا مقدس فریضہ جس کے آگے انسانی وجود تک ہیچ ہو جاتا۔ وہ انسانی وجود جس کا عکس تختے پر بنا کر ہمیں نشانہ باندھنا سکھایا جاتا اور ہم اس میں اتنے طاق ہو جاتے تھے کہ عکس کو اصل سے بدل دیا جاتا تو بھی ہمارا نشانہ نہ چوکتا۔" (۱۶)

سانحہ مشرقی پاکستان پر بہت کم لکھا گیا لیکن یہ ایسا سانحہ نہیں ہے کہ جسے حساس فنکار فراموش کر سکتے سو آج بھی یہ سانحہ کسی نہ کسی صورت ناول یا افسانے میں اپنا اظہار پا لیتا ہے۔ اس کے ایک براہ راست معنی تو یہ ہیں کہ اس سانحے کو ابھی کسی بڑے تخلیقی ذہن اور تخلیقی عمل کی تلاش ہے، اس سانحے کی نمود حمید شاہد کے ناول میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے:

> "جس شکست کی میں بات کر رہا ہوں وہ ہمارے اپنے ہی کارن ہمارے مقدر میں لکھ دی گئی تھی۔ یہ محض تب کا واقعہ نہ تھا جب ہم نے ہتھیار ڈالے تھے بلکہ یہ قسطوں میں ہمیں رسوا کر رہی تھی۔ تم یہ بات نہیں سمجھو گے تم اس بات کو، اپنی حقیقی شدت کے ساتھ سمجھ ہی نہیں پاؤ گے۔ سچ تو یہ ہے کہ ادھر کے لوگ بنگالیوں کو صحیح طرح سمجھ ہی نہیں سکے۔ یہاں ڈنڈے سے، روپے پیسے سے یا پھر مرعوب کر کے سارے کام نکالے جاسکتے ہیں۔ یہاں کے خان جی، چودھری صاحب، ملک صاحب، وڈیرا سائیں اور پیر صاحب اپنے ٹکڑوں پر پلنے والے تم اور تمہارے باپ جیسے لوگوں سے ووٹ بھی لے لیتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ ان کے کامی، مزارعے، رعایا یا پھر ادارت مند ہوتے ہیں۔۔۔ مگر ادھر کا عام بنگالی ایسا نہیں تھا۔" (۱۷)

ناول نگار نے اس مختصر اقتباس میں ملک کے دونوں حصوں کے سماجی و سیاسی شعور کا تقابل کر کے دکھا دیا ہے کہ عام بنگالی آزادی کی حقیقی روح کو سمجھ چکا تھا جبکہ مغربی حصے میں نو آبادیاتی نظام ابھی تک آقا و غلام کے امتیاز کے ساتھ قائم ہے اور آج جدید صنعتی سماج میں بھی اس نظام میں سرمو تبدیلی نہیں آئی۔

ناول میں ''مٹی'' کا استعارہ بلیغ ہے۔ مٹی یعنی زمین کے حصول کی خواہش اپنے جیسے انسانوں کے استحصال پہ اکساتی ہے بلکہ ان کا قتل بھی کرا دیتی ہے چاہے بنگال کی مٹی (زمین) پہ اپنا قبضہ بر قرار رکھنا ہو یا مٹی کا قرض چکانا ہو دونوں صورتوں میں مٹی آدم کو کھا رہی ہے اور آدم جو وجہ تخلیق کائنات ہے وہ اسی مٹی کی نذر ہو رہا یہی آج کے انسان کا المیہ ہے جسے ناول نگار نے بخوبی بیان کیا ہے۔ ناول کے بنیادی استعارے ''مٹی'' کی مزید گرہیں کھولتے ہوئے ڈاکٹر ممتاز احمد خان ناول کے ماجرے کا احاطہ یوں کرتے ہیں:

> "ناول کی مجموعی خوبی یہ ہے کہ وہ ''مٹی'' کی بہر صورت تفہیم کرا دیتا ہے۔ اسے پڑھ کر ایک سوال ذہن میں ضرور ابھرتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے انسان کو مٹی سے کیوں تخلیق کیا اور مٹی ہی میں سپرد کرنے کا حکم کیوں دیا گیا۔ اس امر کو بھی سمجھنے سے ناول کے ماجرے کی گرہیں کھلتی چلی جائیں گی۔ آخر ''مٹی'' ہی تو اس کا فکری محور ہے۔ مٹی کی محبت میں دیوانے ہو جانے والوں کی نفسیاتی گرہ کشائی ہمیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ مٹی کی محبت کے بھیانک انجام پر غور کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ بات دور تک چلی جاتی ہے اور مٹی کے ابعاد (Dimensions) کو بھی واضح کرتی جاتی ہے۔" (۱۸)

اردو ناول نگاری کے بارے میں عام تاثر یہی تھا کہ چند ایک ناولوں کے بعد اب عمومی طور پر یہ صنف ادب سے غائب ہوتی جا رہی ہے۔ اس تاثر کو ابھارنے میں دراصل ہمارے سماجی رویے بھی عامل کا کردار رکھتے ہیں کہ ہمارے سماج میں ناول کا چلن عام نہیں ہو سکا کیونکہ ہماری تہذیبی پرداخت غزل کی ہے حالانکہ غزل سے قبل بڑا شاعر اسے تسلیم کیا جاتا تھا جو مثنوی میں کمالات دکھاتا تھا۔ تاہم کسی حد تک یہ امر درست بھی ہے کہ دنیا بھر میں ناول کی صنف کی مقبولیت کے باوجود اردو ادب میں یہ صنف تنزلی کا شکار ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس سوال کا جواب آئندہ صفحات میں تلاش کرنے کی سعی کی جائے گی، یہاں سر دست یہ ذکر مقصود ہے کہ جب یہ غلغلہ بلند ہوا کہ ناول غائب ہو رہا ہے کہ اسی دوران مرزا اطہر بیگ ''غلام باغ'' اور پھر ''صفر سے ایک تک'' دو اہم ناول لے کر منظر پر ابھرے اور اس ڈوبتی صنف کو سہارا دیا۔ ''غلام باغ'' پر اس سے قبل بھی گفتگو ہو چکی ہے۔ یہاں فقط اکیسویں صدی کے المیوں، دکھوں اور مسائل کے حوالے سے ناول کا مختصر جائزہ مقصود ہے۔

غلام باغ کا پیچیدہ اور تہہ دار بیانیہ معاصر تہذیبی صورتحال کو پیش کرنے کے لیے نہایت مناسب ہے کہ پاکستانی سماج میں میٹروپولیٹن شہروں کی زندگی اتنی ہی تہہ دار اور گنجلک ہو چکی ہے۔ گو کہ ان میں موجود بنیادی سہولتیں دنیا کے جدید شہروں والی نہیں ہیں مگر زندگی کی رفتار اسی قدر تیز اور بے سمت ہے۔ جبکہ ذرا ان شہروں کے مضافات میں جائیں تو قدیم قبائلی

سماج میں اپنے پورے طمطراق کے ساتھ موجود ہیں جو اپنی صدیوں پرانی بوسیدہ روایات اور طرز زندگی کو کندھوں پہ اٹھائے ہے اور اس سے دست کش ہونے کو تیار نہیں۔ اسی تہذیبی زندگی کی تہہ داری کو پیش کرنے کے لیے مرزا اطہر بیگ نے زبان کے ساتھ بھی خاصا انوکھا برتائو کیا ہے۔ وہ اردو زبان کو اپنے ڈھب سے استعمال کرتے ہیں اور جدید تنقیدی ادبی نظریات کا اثر ان کی تشکیل زبان پر واضح دکھائی دیتا ہے۔ ناول میں اطہر بیگ نے کبیر کو جو کہ لکھاری۔ر۔مصنف ہے، مرکزی کردار بنا کر شاید بالواسطہ طور پر لکھاری کی موت کے نظریے کی تکذیب کی ہے۔

انسان نے خود اپنی تہذیب کی ہے۔ خود اس نے ایسے نظریات وضع کیے جو متمد کہلاتے ہیں اور پھر ان پر عمل کر کے وہ متمدن کہلایا۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ قوانین خود کتنے متمدن ہیں؟ ارزل نسلوں کو بظاہر متمدن کہلانے والے انسان خود میں یا اپنے برابر آج بھی جگہ دینے پر آمادہ نہیں ہیں۔ اور اگر کوئی مانگر جاتی کا فرد کسی نہ کسی طرح متمدن افراد کی برابری کا حوصلہ کر لے تو بقول مصنف آج بھی اس کے ساتھ ایسا سلوک روا رکھا جاتا ہے کہ وہ آئندہ نسلوں اور دیگر اپنے ہم زادوں کے لیے سامان عبرت بن جاتا ہے:

> "خادم حسین کا تعلق سوکٹر نہر کے کنارے آباد مانگر جاتی سے تھا۔ اسے وہیں آباد رہنا چاہیے تھا۔ مگر وہ کسی نہ کسی طرح انعام گڑھ کے کاچھر اور پگل چوہدریوں کے درمیان ایک ڈاکیا بن کر آبسا۔ قصبے کی یہ سردار نسلیں مانگر جاتی کو ارذل کاموں اور اسفل دھندوں کے لیے بہت موزوں سمجھتی تھیں۔ اس کے باوجود خادم حسین اپنے آپ کو ایک دیانت دار، فرض شناس، جرات مند حتیٰ کہ خود دار ڈاکیا بنائے پھرتا تھا اس کا یہ رویہ بعض اوقات خاندانی لوگوں میں ایک جھنجھلاہٹ آمیز تنفر کا باعث بن جاتا تھا اور عجیب معمہ نظر آتا تھا۔" (۱۹)

اعلیٰ نسب کے لوگ یہ گمان بھی نہیں کر سکتے کہ ارزل نسلوں میں بھی ایسے فرض شناس لوگ موجود ہو سکتے ہیں اس لیے وہ حیران ہوتے ہیں اور ایسے کسی فرد کو جو فرض شناس ہو کسی اعلیٰ ذات اور نسب رکھنے والے کی ناجائز اولاد تصور کرنے لگتے ہیں کیونکہ:

> "چند کاچھر اور پگل بزرگوں کو اس اچنبھے کی وجہ صاف نظر آتی تھی۔ ''عطر گندی نالی میں بھی بہہ جائے تو تھوڑی بہت خوشبو پھر بھی دے دیتا ہے۔'' سب اس رمز یہ بات کی اصل سمجھ سکتے تھے اور خوب ہنستے تھے۔ سب جانتے تھے کہ مانگر عورتیں ان کے گھروں میں

خدمت گزاری کرتی ہیں اور ایسے ہی رواداری میں کبھی کبھار وہ اپنے مانگر خاوندوں کی
ولدیت کے شبے میں کوئی نسلی بچہ جننے پر بھی مجبور ہو جاتی ہیں۔" (۲۰)

حاکم دین کانٹے والا ہو یا ماسٹر کرم الٰہی جو بھی مانگر جاتی میں سے ارزل کاموں کے علاوہ کوئی باعزت پیشہ اختیار کرتا ہے اسے عبرت کا نمونہ بنادیا جاتا ہے۔ یہی المیہ عہد جدید میں بھی سماج کے پنچ کہلانے والے طبقات کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے۔ ''غلام باغ'' میں تشکیل دی جانے والی فضا فرضی ہونے کے باوجود اسی لیے حقیقی نظر آتی ہے کہ ہمارے آس پاس کی دنیا اس میں سانس لے رہی ہے۔ ''غلام باغ'' کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر امجد طفیل کا کہنا ہے:

"اگرچہ ناول نگار نے سیاست و معاشرت پر بات کم کم کی ہے لیکن بالواسطہ طور پر معاشرے کا جیسا اچھا تجزیہ اس ناول میں موجود میں ہے ایسا کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ ''غلام باغ'' میں ہماری سیاسی سماجی صورت حال اپنی تمام تر ہولناکی کے ساتھ موجود ہے۔ فرد کی دیوانگی کے ساتھ ساتھ اجتماعی دیوانگی۔۔۔ سب سے بڑا کردار کبیر مہدی اس دیوانگی کا مجسمہ ہے جو اپنی موجودہ صورت حال میں ڈرامائی تبدیلی پیدا کرتا ہے۔۔۔ طاقت کے جنون میں مبتلا افسر، سیاست دان اور دولت مند اپنے راستے میں آنے والی ہر چیز کو کس طرح تباہ کرتا ہے اور معاشرے کے تاروپود بکھیرنے میں مبتلا ہے اس کی بہت اچھی تصویر کشی ہمیں اس ناول میں دکھائی دیتی ہے۔" (۲۱)

ناول کے کرداروں اور واقعات میں دیوانگی اور پاگل پن کی کوئی خاص وجہ ہو گی؟ اس کی تعبیر کرتے ہوئے مرزا اطہر بیگ نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا ہے:

"ہاں، دیوانگی ''غلام باغ'' کے بنیادی موضوعات میں سے ایک ہے، فلسفے کے طالب علم کی حیثیت سے بھی یہ موضوع مجھے بہت Fascinate کرتا ہے، ہمیشہ سے یہ احساس رہا ہے کہ فرزانگی اور دیوانگی میں بال برابر فرق ہے۔ دیوانگی کا موضوع ناول کے پلاٹ سے بھی متعلق تھا۔ اس ناول میں ایک اہم پہلو یہ ہے کہ اس میں زبان کردار کے طور پر سامنے آتی ہے۔ مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ دیوانگی بڑی حد تک ایک لسانی مسئلہ ہے۔ جب ہمارے لسانی نظام میں کسی سطح پر بگاڑ پیدا ہوتا ہے، تب ہی دیوانگی کا اظہار ہوتا ہے۔۔۔ بات دیوانگی برائے دیوانگی پر ختم نہیں ہوتی، بلکہ یہ وجود کی، انسان کی انسان سے تعلق کی ایک اور سطح تلاش کرنے کی کوشش ہے۔" (۲۲)

ناول کے غلام باغ میں یورپی باشندے کی موجودگی شاید اس مغربی بالادستی کی طرف اشارہ ہے جو قبل ازیں بلاواسطہ اور اب بالواسطہ ہمیں تہذیب کا درس سکھا رہے ہیں اور شاید ہم لوگ جو اپنی اصل تہذیبی وراثت دریافت کرنا چاہتے ہیں اس دریافت میں بھی ان کے محتاج ہیں۔ گویا آج بھی نو آبادیاتی اثرات سے سماج نکل نہیں پایا جو کہ حقیقت ہے۔ یعنی ہم آج بھی تہذیبی تشخص کو مغرب کے ذریعے دیکھنے پر مجبور ہیں۔ ظاہر ہے یہ علمی و تکنیکی محتاجی تب تک رہے گی جب تک ہمارے قلم کار جیسے کبیر ہے، وہ نہیں لکھتے جو وہ لکھنا چاہتے ہیں، ورنہ عوام کو محض تماشا دکھاتے رہنے سے تبدیلی کا عمل وقوع پذیر ہونا ممکن نہیں ہے۔ کبیر مہدی ناول میں تبدیلی کی قوت لے آتا ہے لیکن اس کی علمیت محض طنزیہ جملوں اور بے باکی سے آگے نہیں بڑھتی:

> "وہ ذہنی اور علمی سطح پر سب سے آگے ہے لیکن اپنی قومی زبوں حالی اسے ایک ایسے ناکارہ فرد میں تبدیل کر دیتی ہے جو فرضی ناول سے قلم کی مزدوری کر کے اپنی روزی کماتا ہے اور اصل تخلیقی کام جو وہ کرنا چاہتا ہے کبھی نہیں کر پاتا۔ ایسے میں کبیر پسماندہ ممالک میں بسنے والے تخلیق کارون کے استعارے میں ڈھل جاتا ہے۔" (۲۳)

''غلام باغ'' پاکستانی سماج میں رائج تاریخی جبر کی بھی نشاندہی کرتا ہے جو یہاں صدیوں سے اشرافیہ طبقات نے رائج کر رکھا ہے، یہ اعلیٰ طبقات کمتر طبقات کا استحصال کرتے ہیں اور یہ استحصال فقط کمتر طبقات کی محنت چرانے کا نہیں بلکہ ان کی ذہانت چرانے کا بھی ہے۔ جدید عہد کا یہ بھی المیہ ہے کہ طاقتور اقوام تیسری دنیا کے ذہین دماغوں کو ہر طرح کی آسائش دکھلا کر لے جاتے ہیں اور ان سے اپنے ممالک اور اقوام کی ترقی کے کام لیتے ہیں ایسا زندگی کے ہر شعبہ میں ہو رہا ہے۔ یہاں بھی اخبار نویس یا مدیر عصری ڈائجسٹ کی خواہش کے مطابق تخلیق کار کبیر کو کام کرنا پڑتا ہے۔ دراصل مدیر کو بھی عوامی خواہشات کا احترام کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ اس کے مفادات بھی عوام میں مقبولیت حاصل کرنے سے مکمل ہوں گے ایسے ہی کبیر کا رزق بھی ایسے کام سے وابستہ کر دیا گیا ہے جو اسے پسند نہیں:

> "کبیر نے قہقہہ لگایا، میں ایک کرائے کا ادیب ہوں سر بلکہ ادیب شاید زیادہ باعزت لفظ ہے۔ میں ایک کرائے کا لکھنے والا ہوں جیسے کرائے کے قاتل ہوتے ہیں ناں جی۔ I am a mercenery writer sir ---دنیا کے کسی موضوع پر پائے جانے والے کسی بھی قسم کے نقطۂ نظر کو ثابت کرنے کے لیے پورے مدلل طریقے اور مکمل روانی طبع سے لکھ سکتا ہوں کوئی بھی آجائے معاملہ طے کرلے اور کچھ بھی لکھوالے---" (۲۴)

بعینہ یہی صورت یاور عطائی کی بھی ہے۔ وہ بھی ارزل نسلوں کا نمائندہ ہے لیکن جنسی طاقت کی دوا بیچتا ہے اور امراو اشراف اس کے گاہک ہیں۔ ناول نگار نے یہاں بھی علامت سے کام لیا ہے۔ یعنی اگر ارزل نسلوں کا کوئی فرد سماج کی کسی خامی کو مٹانا چاہتا ہے تو اعلیٰ طبقات اسے بھی اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ جنسی قوت کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ اعلیٰ طبقات اپنی چالاکی سے ارزل نسلوں کی ذہانت کو استعمال کر کے ان نسلوں کو ہی اپنا غلام بنائے رکھتے ہیں۔ اس لیے ناول کا ایک موضوع غلامی بھی ہے۔ اور یہ غلامی ایک قوم کے اندر مختلف طبقات سے لے کر عالمی سطح پر ترقی یافتہ اور ترقی پذیر طبقات تک پھیلی ہوئی ہے۔ صدیوں کی یہ تاریخی جبریت لوگ قبول کیے ہوئے ہیں۔ یہ زیادہ بھیانک اور فکر انگیز پہلو ہے۔ مرزا اطہر بیگ کا دوسرا ناول ”صفر سے ایک تک“ ہے۔ جس طرح ”غلام باغ“ میں انسان انسانوں کو غلام بنا رہے ہیں۔ یہاں بھی صورتحال ایسی ہے۔ نسل در نسل چلتی غلامی عہد جدید میں محض اپنی صورت بدل لیتی ہے۔ زمین پر مزارع اور منشی کا کام کرنے والے کرداروں کی منشی کی ہیئت سائبر سپیس میں بھی نہیں بدلی:

> "”صفر سے ایک تک“ سارے کا سارا ناول کمپیوٹر پروگرامنگ، انٹرنیٹ اور اس کے استعمال کی نئی نئی دریافتوں کا بیانیہ ہے۔ ناول کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد کمپیوٹر ہمیں ایک اور ہی دنیا کی شے نظر آتا ہے۔۔۔ سائبر سپیس کا منشی جو ناول کا بنیادی کردار ہے وہ کمپیوٹر پروگرامنگ اور نئی نئی ویب سائٹ سے قاری کو متعارف کرواتا ہے اور مختلف قسم کی گیمز (انسانی گیمز) سے آشنائی کرواتا ہے۔" (۲۵)

مذکورہ ناول اپنی لسانی تشکیل کے حوالے سے ”غلام باغ“ کا تسلسل ہے۔ ”سالار“ کا کردار دراصل بالادست طبقات کا کردار ہے جو ہمیشہ سے ہیں اور پاکستان کی سماجی صورتحال دیکھ کے لگتا ہے کہ ہمیشہ رہیں گے۔ سماج کے بالادست اور اشرافیہ طبقات جو خود کو خاندانی اور نسلی کہلاتے ہیں دراصل بد طینت اور استحصالی کردار ہیں۔ لوگ ان کے لیے کارآمد چیزیں ہیں اور جب ان کی ضرورت ختم ہو جائے انہیں پھینک دیا جاتا ہے۔ گویا ناول عہد جدید میں انسان کے استحصال کو موضوع بناتا ہے۔ اقبال خورشید کے ساتھ ایک انٹرویو میں ناول ”صفر سے ایک تک“ کے موضوعاتی دائرے کی وضاحت کرتے ہوئے مرزا اطہر بیگ کا کہنا تھا:

> "۹/۱۱ کا حوالہ اس میں ضرور آتا ہے۔ لیکن وہ بنیادی موضوع نہیں۔ اس کا اصل موضوع کمپیوٹرائزیشن یا ڈیجیٹل انقلاب تھا۔ جس نے ہمارے معاشرے پر بھی گہرے اثرات مرتب کرنے شروع کر دیے ہیں۔ میرے سامنے سوال تھا کہ جو سائبر اسپیس کی دنیا بنی ہے، وہ

ہمارے روایتی تصورات، جاگیر داروں اور نام نہاد دانشوروں پر کس طرح اثر انداز ہو رہی
ہے۔۔۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ موضوع کے اعتبار سے یہ ناول لمحہ حال کی دنیا کی، غیر معمولی
پن کا احاطہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔" (۲۶)

اکیسویں صدی کے موضوعات میں بھی تنوع ہے۔ صارفیت کے کلچر نے پاکستانی سماج کی اخلاقی اقدار اور روحانی اساس کو زک پہنچائی ہے اسی طرح میڈیا کی بڑھتی ہوئی یلغار بھی ابھی تک مثبت سرگرمی نہیں دکھا سکی۔ انٹرنیٹ اور دیگر ذرائع نے معلومات تک رسائی آسان کر دی ہے لیکن ذہنی تربیت اس سطح کی نہیں ہو سکی کہ سماج ان سے فوائد حاصل کر سکتا۔ عالمگیریت، مابعد سرمایہ داریت، دہشت گردی، بنیاد پرستی، عالمی تنازعات، افغان امریکہ جنگ وغیرہ ایسے موضوعات ہیں جو کسی حد تک اردو ناول کا موضوع بنے ہیں۔ لیکن ان آفاقی مسائل کی کھوج اور حل تک ابھی تخلیقی فنکار دسترس نہیں کر سکا۔ ۱۱/۹ کے بعد یک قطبی ہو جانے والی دنیا مزید امریکی سامراج کے عزائم کا نشانہ بنی ہوئی ہے۔ اس صورتحال میں پاکستانی سماج بالخصوص عالمی و علاقائی حالات سے شدید متاثر ہو رہا ہے۔ پاکستان کی سرحدوں پر عسکری شدت پسندی کا دبائو، فرقہ واریت، نسلی ولسانی تنازعات، قبائلی جھگڑے جدید ناول کا موضوع ہیں۔ بڑھتی ہوئی صارفیت، زندگی کی خالصتاً کمرشل بنیادوں پر تعبیر، اشیا کی اہمیت، حقیقت کا التباس، عالمی کلچر کے اثرات، احساس تنہائی، وجودی کرب، زندگی سے مغائرت اور عدم دلچسپی، مسائل کا درست ادراک نہ ہونا، فکری و نظریاتی الجھنیں اور غیر یقینی صورتحال بھی ناول میں نظر آنے والے موضوعات ہیں۔

عدم شناخت، انسانی قدروں کی شکست وریخت، قدیم اور جدید میں تصادم، متصادم مذہبی نظریات سے انسانی ذہن میں جنم لیتی تشکیک اور غیر یقینی صورتحال بھی ناول کا موضوع بنتی نظر آ رہی ہے۔ البتہ ابھی اردو ناول کے دائرے میں وسعت کی گنجائش موجود ہے کیونکہ یہی وہ صنف ادب ہے جو تنگ دامانی کا شکوہ نہیں کر سکتی اور اسی صنف میں انسانی شکست وریخت اور درد و کرب کا بڑا تخلیقی اظہار کسی حد تک ہوا بھی ہے لیکن ابھی مزید اظہار کا منتظر بھی ہے۔

حوالہ جات

1. اشفاق رشید، "شدت"، (لاہور: دستاویز مطبوعات، ۱۹۹۸ء)، ص ۱۲
2. شاہد صدیقی، "آدھے ادھورے خواب"، (لاہور: جہانگیر بکس، ۲۰۰۹ء)، ص ۱۷
3. سلمان صدیق، "ماہ مایا"، (لاہور: دستاویز مطبوعات، ۱۹۹۸ء)، ص ۳۰
4. محمد سعید شیخ، "زمین کا دکھ"، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء)، ص ۶۰
5. شاہد صدیقی، "آدھے سے ادھورے خواب"، ص ۱۱۰
6. محمد سعید شیخ، "زمین کا دکھ"، ص ۶۱
7. امجد طفیل، "پاکستانی اردو ناول بیسویں صدی کی ابتدائی دہائی میں"، مشمولہ: کتابی سلسلہ: اسالیب سالنامہ، مرتبہ: عنبرین حسیب عنبر (کراچی: اسالیب پبلی کیشنز، جلد اول، جولائی ۲۰۱۱ء تا دسمبر ۲۰۱۲ء)، ص ۶۱۴
8. حسن منظر، "دھنی بخش کے بیٹے"، (کراچی: شہر زاد، ۲۰۰۸ء)، ص ۳۵
9. روبینہ سلطان، "تین نئے ناول نگار"، (لاہور: دستاویز، ۲۰۱۲ء)، ص ۱۰۷، ۱۰۶
10. حسن منظر، "دھنی بخش کے بیٹے"، ص ۴۹۳، ۴۹۲
11. روبینہ سلطان، "تین نئے ناول نگار"، ص ۲۱۳، ۲۱۴
12. محمد عاصم بٹ، "دائرہ"، (لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء)، ص ۲۳۳
13. انور سدید، ڈاکٹر، "دائرہ ایک پراسرار ناول"، مشمولہ: ماہنامہ قومی زبان، مدیر: ڈاکٹر ممتاز احمد خان، (کراچی: انجمن ترقی اردو، دسمبر ۲۰۱۰ء) ص ۳۲
14. محمد عاصم بٹ، "دائرہ"، ص ۱۷۰
15. امجد طفیل، "پاکستانی اردو ناول بیسویں صدی کی ابتدائی دہائی میں"، ص ۶۲۵، ۶۲۶
16. محمد حمید شاہد، "مٹی آدم کھاتی ہے"، (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۷ء)، ص ۷۰
17. ایضاً، ص ۳۷
18. ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، "اردو ناول کے ہمہ گیر سرکار"، (کراچی: سرائے پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء)، ص ۱۴۴
19. مرزا اطہر بیگ، غلام باغ (لاہور: سانجھ پبلیکیشن، ۲۰۱۲ء)، ص ۶۶

20. ایضاً، ص٦٦

21. امجد طفیل،ڈاکٹر، "غلام باغ کا تجزیاتی مطالعہ"، مشمولہ: کتابی سلسلہ: اجرا، شمارہ ۱۰، مدیر: احسن سلیم (کراچی: Beyond Time Publications، ۲۰۱۳ء)، ص ۵۳۳۔

22. اقبال خورشید، "غلام باغ خود کو دریافت کرنے کا وسیلہ بنا"، مصاحبہ: مرزا اطہر بیگ، مشمولہ: کتابی سلسلہ: اجرا، شمارہ ۱۳، جنوری تا مارچ، مدیر: احسن سلیم (کراچی: Beyond time Publication، ۲۰۱۲ء)، ص ۵۳۔

23. امجد طفیل،ڈاکٹر، "غلام باغ کا تجزیاتی مطالعہ"، ص ۵۲۷۔

24. مرزا اطہر بیگ، "غلام باغ"، ص ٩٦

25. روبینہ سلطان، تین نئے ناول نگار، ص ۱۸۵

26. اقبال خورشید، "غلام باغ خود کو دریافت کرنے کا وسیلہ بنا"، ص ۵۶،۵۵۔